اقبال اور معاصر تعلیمی مسائل

ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
tariqhashmi70@gmail.com

علامہ اقبال نے بطور ایک سماجی مفکر کے اپنی تخلیقات میں بہت سے معاصر مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تعلیم، نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم پر بطورِ خاص توجہ کی ہے۔ آپ نے نئی نسل پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے انھیں ایسی مثالی فضا کی فراہمی پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے اندر قائدانہ صلاحیتوں کو نکھارنے کے قابل ہو سکیں۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے نو آبادیاتی آقاؤں کو طرزِ حیات کو اختیار کریں دوسری طرف وہ مشرقی نظامِ تعلیم کے بھی ناقد ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ نظام نوجوان نسل کو جمود کی طرف لا کر اُن کے اندر تحریک کو ختم کرتا ہے۔

موجودہ عصر میں نوجوان نسل مغرب و مشرق کے درمیان تہذیبی تصادم کا سامنا کر رہی ہے۔ اسی تناظر میں تعلیم سے متعلق اقبال کے افکار ایک فلسفیانہ رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور نوجوانوں کو قیادت کے لائق بنانے کے لیے درست فکری انتخاب کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں مختلف شعبہ ہائے حیات اور اُس سے وابستہ افراد سے ایک نوع کی بے زاری اور یاسیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ اہل مذہب، اہلِ سیاست، اہلِ مسند اور اہلِ سجادہ و خانقاہ کم و بیش ہر طبقے سے مایوس نظر آتے ہیں لیکن ایک حلقہ ایسا ہے جو اُن کی اُمیدوں کا مرکز و محور ہے اور وہ نوجوان ہیں، جن کی مثال اُن کے نزدیک چمن حیات میں گل لالہ کی سی ہے، اور وہ اُسے اپنے پورے جوبن پر دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ اس کی آبیاری کے سلسلے میں اپنی مکمل توجہ صرف کرتے نظر آتے ہیں۔

اس تناظر میں اقبال کی شاعری میں موجود تعلیم سے متعلق تصورات کو دیکھا جائے تو کئی ایک معاصر مسائل اور اُن کے حل کی جانب ایک تخلیقی نشان دہی موجود ہے۔ اس سلسلے میں پہلی قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک تعلیم محض وسیلۂ علم و ارتقا نہیں بلکہ اگر اس کی سمت درست نہیں یا نظامِ تعلیم مربوط نہیں تو یہی تعلیم ذریعۂ جہل و زوال بھی ہے۔ وہ جو اکبر نے مغرب کے نظامِ تعلیم پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی[1]

تو اقبال بھی تعلیم کو ایسا تیزاب سمجھتے ہیں جس سے نوجوانوں کی خودی کو پگھلایا جاسکتا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے، اُسے پھیر[2]

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اقبال تعلیم و تدریس کے عمل میں کئی ایک جتھوں سے شریک رہے اور اُن کے عملی و فکری تجربات کے باعث یہ کہنا درست ہو گا کہ:

"اقبال کے تعلیمی تصورات اور تربیتی منشور کے کئی مقدمات ہیں۔ مشرقی درسیات کے دائرۂ کار کی زمانہ قدیم سے دورِ جدید تک کی تاریخ اقبال کے پیش نگاہ تھی۔"[3]

اقبال کی نظر مشرقی درسیات پر بھی تھی اور جدید تعلیم کے مضرات و افادات پر بھی۔ نیز وہ جدلیاتی صورتِ حال بھی اُن کے سامنے تھی جو برصغیر کے تعلیمی ماحول میں مغرب و مشرق کے افکار کے پس منظر میں موجود تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کس نوع کی تعلیم کو باعث ارتقا اور کس نظامِ تعلیم کو وجہ زوال قرار دیتے ہیں۔ اس سے قبل کہ اس نکتے پر جامع بحث کی جائے یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ اقبال محض ترسیل علم کو زندگی کے عمل میں کاملیت کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ بصیرت افروزی کو بھی لازمی خیال کرتے ہیں کہ محض علم و دانش، نہ جاننے سے جاننے تک کا سفر ہے لیکن حقیقت سے آشنائی کے بعد حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لیے بصیرت اور نظر بھی درکار ہے۔

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں، اہلِ نظر کم یاب ہیں
کہا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ[4]

معاصر تعلیمی مسائل کے تناظر میں فکر اقبال کو اپنے سماجی و علمی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کی تشکیل کے ساتھ ہی اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے ان میں وہ نظام تعلیم بھی تھا جو نوآبادیاتی آقا اپنے ساتھ لائے۔ اقبال اس نظام کے جن پہلوؤں کے شاکی نظر آتے ہیں اُن میں اوّلیں قابلِ ذکر تشکیک اور لادینیت کا عنصر ہے۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی مغرب کا تصورِ علم:

"اپنی بنیاد تشکیک پر رکھتا ہے۔ اسی تشکیک سے جہاں ایک طرف یہ مثبت فائدہ ہوا کہ فطرت کے بہت سے بھید آشکار ہوئے ہیں، اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ قدروں کی ابدیت اور ایمان و یقین کی قوت بھی معرضِ شک میں آگئی۔"[5]

ابدی قدروں کا معرضِ شک میں آنا ایک بڑا فکری حادثہ ہے جس کے باعث اقبال مغرب کے نظامِ تعلیم کو دینِ مروت کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ[6]

مغرب کے نظام تعلیم پر اُن کے دوسرے بڑے اعتراض کی بنیاد تعلیم برائے معاش کا تصور ہے کہ حصولِ علم محض اس لیے کیا جائے کہ مستقبل میں ملازمت کے ذریعے اقتصادی تحفظ مل جائے اور دو چار حرف جو پڑھ کر رکھے ہوں، اُن کی بنیاد پر سرکار کی خدمت کر کے حصولِ رزق کا انتظام کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک علم و آگہی کے ساتھ اس طرزِ فکر نے نوجوانوں کے اندر حرکت و عمل کی روح کو قبض کر لیا ہے:

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو[7]

نو آبادیاتی آقاؤں کے متعارف کردہ نظامِ تعلیم سے شاکی ہونے کا ایک تہذیبی، سماجی اور علمی جواز موجود ہے کہ اقبال اس نظام سے وابستہ فکری خطرات سے بخوبی آگاہ تھے لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اقبال مغرب کے تعلیمی نظام سے کہیں زیادہ مشرقی تعلیمی ماحول سے بے زار اور نالاں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ امر افسوس ناک ہے کہ جن شکایات کی بنیاد پر وہ مشرقی تعلیمی ماحول کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں میں کسی نہ کسی سطح پر موجود ہیں۔ اقبال کو یورپ کے نظامِ تعلیم پر اعتراض یا اُس سے اختلاف تہذیبی اور سیاسی بنیادوں پر تھا اور وہ ہونا بھی چاہیے تھا کہ وہ نظام ایک خاص طرح کی تہذیبی فکر یا سیاسی تسلط کی بنیاد پر متعارف کروایا گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن اقوام نے اپنے نظامِ تعلیم کے سہارے اپنی ایک سمت کا تعین کیا اور کامیابی کی منازل طے کیں جبکہ اہلِ مشرق نے اپنے تعلیمی ماحول کو کوئی ایسی مضبوط اساس فراہم نہیں کی کہ وہ اپنی علمی شناخت کو مستحکم کر سکیں۔

اقبال کے نزدیک اہلِ مشرق کے نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خامی وہ گھٹن اور حبس زدگی ہے جو اذہان کو کشادگی فکر کی جانب راغب نہیں ہونے دیتی اور عصری ماحول میں جبکہ اقوام ذہنی کشادگی کو اسباب بناتے ہوئے اپنی استعدادِ ایجاد سے دنیا کا نقشہ بدل رہی ہیں، ہم روایتی افکار کے بھی انتہائی نزاعی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ[8]

عصری نظامِ تعلیم میں نصاب سے لے کر تعلیمی اداروں کے ماحول تک طالب علموں کے گلا گھونٹنے کا عمل نہ صرف جاری ہے بلکہ اربابِ انتظام کے نزدیک پسندیدہ بھی ہے۔ دنیا بھر کے تعلیمی ادارے اب ترسیلِ علم (Transformation of Knowledge) سے آگے بڑھ کر تخلیقِ علم (Creation of Knowledge) کی طرف گامزن ہیں اور ادارے نئے سے نئے علوم متعارف کرا رہے ہیں جبکہ ہمارے ہاں آج بھی کہنہ روایات کی پاسداری کا آدرش موجود ہے جو تشکیلِ نصاب سے لے کر اسلوبِ تدریس تک میں اپنی جلوہ گری دکھا رہا ہے۔ ایسے میں کوئی فکر تازہ کی تلاش یا کسی راز کے انکشاف کی صورت کیسے پیدا ہو۔ اسی تناظر میں یہ سوال بہت بامعنی ہے کہ:

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟[9]

اقبال کا یہ استفہام غیر معمولی نوعیت کا ہے اور معاصر تعلیمی مسائل کے تناظر میں نہایت اہم ہے۔ ہمارے تعلیمی ماحول میں کوئی رعنائی فکر یا لذتِ اسرار کیوں نہیں ہے؟ اس کی بنیادی وجہ وہ خوف ہے جو کہنہ روایات کے احترام کے نام پہ پیدا کیا جاتا ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو نوجوانوں کے پرواز کو کتر دیتا ہے:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا[10]

اقبال کے تصورِ تعلیم پر بات کرتے ہوئے محض اس نکتے پر زور دنیا کو ہمارا نظامِ تعلیم یورپ سے مستفاد ہے اور اقبال اُس کے کڑے ناقد ہیں، معاصر حقائق کی روشنی میں قطعی درست نہیں ہے۔

جوہر میں ہو "لا الٰہ" تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ[11]

گویا کہ اصل مسئلہ کسی نظام کا نہیں بلکہ افراد کے اُس جوہر کا ہے جس کی تابانی سے وہ انفرادی و اجتماعی ترقی کا راستہ حاصل کرتے ہیں اور اہلِ مشرق کے تعلیمی ماحول کا سب سے بڑا نقص ہی یہی ہے کہ باطن میں موجود "لا الٰہ" یعنی بت شکنی کے جوہر کو زنگ لگایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر ایک غلامانہ سوچ ہے، جس کا تسلسل جاری و ساری ہے۔

رالف رسل نے مشرق کے اسلوبِ تعلیم کے حوالے سے ایک بنیادی بات کہی ہے کہ مشرق کا نظامِ تعلیم "پڑھو، مانو اور دہراتے رہو"[12] کی بنیاد پر قائم ہے۔

یہی وہ سنگلاخ رویہ ہے جو ہمارے ہاں علم و تحقیق کے کسی چشمے کو پھوٹنے نہیں دیتا اور ایک قطعی غیر تخلیقی فضا کو جنم دیتا ہے۔ یہ بات گویا ایمان میں داخل کر دی گئی ہے کہ جو کہہ دیا گیا ہے اور تم نے سن لیا ہے وہی سچ ہے اور اسی سچ کی تکرار اور ترسیل تمہارا فرض عین ہونا چاہیے۔ تکرار و ترسیل محض اور تحقیق و جستجو سے گریز کے اس رویے نے ہمارے باطن میں تخلیقی سوتوں کو خشک کر دیا ہے اور ہر اہلِ نظر فی زمانہ بھی اس گریہ زواری سے دوچار ہے کہ۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے بیزار
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ[13]

حرکت و اضطراب ایسی صفات ہیں جو اقبال نئی نسل میں دیکھنے کے تمنائی ہیں لیکن اس کی آرزو کی تکمیل کے لیے اسے جو تعلیمی ماحول دستیاب ہے۔ اُسی میں سکون اور اتباعِ محض بنیادی صفات ہیں۔ اقبال کسی طوفاں سے آشنائی کی آرزو تو کرتے ہیں لیکن زمینی حقیقت یہ ہے عصری تعلیمی

ماحول کے بحر میں کوئی ایسی موجِ مضطرب نہیں پائی جاتی جو اُسے جمود سے حرکت کی جانب رغبت دلائے۔

اقبال نئی نسل کو کشتِ زرخیز سمجھتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اُسے کہیں سے ذرا سا نم دستیاب ہو۔ اب عصری تعلیمی ماحول میں ہمارے لیے یہ سب سے بڑا چیلنج ہے کہ اُسے یہ نمی کس گھٹا، کس چاہ سے یا کون سے دریا سے میسر آئے گی؟ یہ وہ سوال ہے جس پر تہذیبی تصادم یا مشرق و مغرب ایسی کشمکش سے ماورا ہو کر اجتماعی سطح پر سوچنے کی ضرورت ہے کہ فی زمانہ ہمارے نوجوان اقبال کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں کہ:

نور کا طالب ہوں، گھبراتا ہوں اِسی بستی میں مَیں
طفلکِ سیماب پا ہوں، مکتبِ ہستی میں مَیں[14]

حوالہ جات

۱۔ اکبر الٰہ آبادی۔ کلیاتِ اکبر۔ کراچی: پنجاب پبلشرز، س ن، ص ۳۸۴۔
۲۔ اقبال۔ کلیدِ کلیاتِ اقبال۔ مرتب احمد رضا، لاہور: ادارہ اہلِ قلم، ۲۰۰۵ء، ص ۶۶۶۔
۳۔ ڈاکٹر عبدالحق۔ اقبال اور تعلیم و تربیت، مشمولہ "کیا آج اقبال کی ضرورت ہے"۔ مرتبین: ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ادارہ تصنیف و تالیف، فیصل آباد: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، س ن، ص ۵۰۔
۴۔ کلیدِ کلیاتِ اقبال۔ ص ۵۹۲۔
۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی۔ اقبال__ دیدۂ بینائے قوم۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص ۵۷۔
۶۔ کلیدِ کلیاتِ اقبال۔ ص ۲۳۸۔
۷۔ ایضاً، ص ۶۷۸۔
۸۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔
۹۔ ایضاً، ص ۳۹۲۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۶۸۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۶۰۰۔
۱۲۔ رالف رسل۔ اردو ادب کی جستجو۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۸۶۔
۱۳۔ کلیدِ کلیاتِ اقبال۔ ص ۳۷۸۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۸۶۔